انٹرنیٹ ایڈیشن

مجلہ

افکارِ قاسمی

ایریل تا جون 2018

زیر نگرانی

مولانا کلیم احمد قاسمی

مدیر اعزازی

ناصر الدین مظاہری

مجلہ
افکارِ قاسمی
اپریل تا جون 2018
زیرِ سرپرستی
مولانا مبارک علی مظاہری
زیرِ نگرانی
مولانا کلیم احمد قاسمی
مدیرِ اعزازی
ناصر الدین مظاہری
معاون مدیر
محمد داود الرحمٰن علی
الغزالی
دینی، علمی، اصلاحی، کمپوز شدہ مضامین قابل قبول ہوں گے۔
نزاعی اور اختلافی نیز سیاسی مضامین شائع نہیں ہوں گے۔
مضمون نگاروں کی تمام آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔
تمام کمپوز شدہ مضامین صرف بذریعہ ای میل ارسال کریں۔
ہر شمارہ ڈاؤنلوڈ کر کے محفوظ کرلیں ای میل سے نہیں بھیجا جائے گا۔
پیشکش
الغزالی اردو فورم www.algazali.org

غلامی کے بدلتے نظریئے

اداریہ — ناصرالدین مظاہری

۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کی وہ تاریخ ساز گھڑی تھی جب ہندوستان کے افق پر آزادی کا سورج طلوع ہورہا تھا یا بالفاظ دیگر جب ہندوستان میں غلامی کا سورج غروب ہورہا تھا، ہم خوش تھے اور ہماری خوشی ایک فطری جذبہ تھی کہ سینکڑوں سال کے بعد غلامی کی دلدل سے نکل کر آزادی کا سانس لے رہے ہیں ......مگر......افسوس! ہم جس چیز کو آزادی سمجھ رہے تھے وہ "غلامی" کی ایک بدلی ہوئی تصویر تھی، پہلے ہمارے جسم غلامی کی طوق میں جکڑے ہوئے تھے اور اب ہمارا فکر غلامی کے عفریت میں پھنسا ہوا ہے...... پہلے ہمارے گھروں میں کھانے سے لے کر پینے تک...... پہننے سے لے کر اوڑھنے تک جتنی چیزیں تھیں وہ سب ہماری تھیں، ہمارے ملک کی پیداوار تھیں، ہمارے لوگوں کی دستکاری تھی، خالص ہندوستانیوں کے دماغوں اور پسینوں کا نتیجہ تھی، جو بھی چیز تھی اس کے استعمال سے یک گونہ خوشی ومسرت حاصل تھی کہ یہ چیز خالص ہے اور ہماری ہے ......لیکن......اب کوئی چیز خالص نہیں رہی......کھیتیاں ہماری ہیں بیج یہودیوں کا ہے...... بیڈ اور فرنیچر کی لکڑی ہماری ہے مگر کاریگری باہری ہے...... ہمارے گھروں میں جلنے والی ٹیوب لائٹس، چلنے والے اے سی سسٹم، پانی گرم کرنے والے آلات، خبریں نشر کرنے والا ٹی وی، کمپیوٹر، سڑکوں پر دوڑنے والی رنگ برنگی کاریں، دریاؤں میں ہچکولے کھاتی سمندری کشتیاں، تیرتے جہاز، اڑتے چنگھاڑتے جنگی طیارے، گرجتے میزائل، برستے بم جو کچھ بھی ہم اپنا کہہ کر استعمال کررہے ہیں وہ صحیح معنوں میں ہمارا نہیں ہے، ہم صرف اس کے خریدار ہیں، اس کا سامان امریکہ کا، اس کی مشینری جاپان کی، اس کا دماغ چین کا تو اس کا پیٹرول گلف ممالک کا ہے، صرف لے دے کے چلانے والے ہمارے ہیں لیکن سکھانے والے؟ امریکہ، روس، جاپان اور فرانس کے ......کیا یہ تعجب کی بات نہیں ہے کہ دہلی اور (بنگال کے علاوہ) ہندوستان کے کئی صوبوں میں میٹرو ریل کا تعمیراتی کام ملکی نہیں غیر ملکی ہے، اس کے انجینئر، ماہرین، مشینیں، ٹیکنالوجی ہمارا کچھ بھی نہیں ہے اگر ہے تو ہماری زمین اور ہمارے مزدور جن کو دو وقت کی روٹی نے اب بھی "نوکری" پر مجبور کیا ہوا ہے۔

ہم خوش ہوتے ہیں اور ہماری یہ خوشی حق بجانب ہے کہ ہمارا ملک بہت سے ایشیائی مما لک میں ترقیات میں بہت آگے ہیں لیکن یہ کیسی ترقی ہے؟ جہاں اونچے عہدوں پر شہدوں کا راج ہے، سفید فام یا سیاہ فام امریکیوں کی حکمرانی ہے، فوجی ہمارے ہیں لیکن ان کو تربیت دینے والے اسرائیلی ؟ کیوں؟ اسرائیل جیسا ننھا سا ملک اس قدر ترقی کر گیا کہ آج اس کے پاس شاندار لائق کاشت آراضی ہے، بہترین قابل اعتماد انجینئر ہیں، مضبوط ترین دفاعی سسٹم ہے، ایٹمی ہتھیاروں سے مالا مال ہے، جنگی جہازوں اور سازو سامانوں کا بیوپاری ہے، بڑی بڑی صنعتیں ہیں، اپنا ذاتی راڈار ہے، شاندار قسم کا اپنا سرور ہے، (یہ بات شاید بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ انٹرنیٹ کے سرور دنیا بھر میں ایک درجن سے بھی کم ملکوں کے پاس ہیں) فوجی حکمت عملی ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارا ملک جو صرف اور صرف ہمارا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ آج تک ہندوستان اپنا بہترین قسم کا جنگی سامان تیار نہیں کر سکا، کیا وجہ ہے کہ غاصب ملکوں سے خوف زدہ ہے اور ان کی ہاں میں ہاں ملانے اور جی حضور کرنے میں شرم محسوس نہیں کرتا، کیا وجہ ہے کہ اپنے آپ کو بادشاہ تصور کرانے کے بجائے دوسروں کی بادشاہت تسلیم کرنے پر تلا رہتا ہے؟

اے ملکی امراء اور وزراء! آگے بڑھو، ڈر کو اپنے سے دور کرو، میدان تمہارا منتظر ہے، اپنے ایٹمی پلانٹ تیار کرو، ایسا سامان بناؤ جس کے باعث دنیا والے ہندوستان کی قوت کے آگے سر تسلیم خم کریں، وہ مما لک جو آئے دن ہمیں آنکھ دکھاتے ہیں ہم ان کو آنکھ دکھا سکیں؟ وہ طریقے اپنائیں جن کی وجہ سے عالمی طور پر ہمارا وقار و معیار اور بھرم استوار ہو سکے، وہ فوج بنائیں جو دوسروں کا سہارا بن سکے، ایسی مشینیں ایجاد کریں جو دیگر ملکوں کی مجبوری بن جائیں۔

کب تک غلامی کی طوق اپنے گلے میں ڈال کر دنیا بھر میں ہندوستان کی رسوائی اور جگ ہنسائی کراؤ گے؟ خدارا! اٹھئے! اور تمام غیر ملکی اشیاء کو کباڑ خانے میں ڈال کر آگے بڑھنے کا ہنر و حوصلہ پیدا کیجئے، امپورٹ سے زیادہ ایکسپورٹ پر دھیان دیجئے، برآمدات سے زیادہ درآمدات پر توجہ دیجئے...... اپنی نئی نسل جو بے روزگار ہے اس کو روزگار کے مواقع فراہم کیجئے، اپنا دماغ استعمال کیجئے، اپنی قوتوں کو سمجھنے کی کوشش کیجئے، بہت دنوں ہم دست نگر بنے رہے اب دوسروں کو اپنا دست نگر بنانے کے بجائے ان کا مسیحا بنئے اور دنیا پر چھا جانے کا اپنے اندر ہنر و حوصلہ پیدا کیجئے اور پھر شوق سے گنگنائیے......ع:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا

مادی علوم کے اسلامی اصول

محمد طارق غازی، دائریکٹر: امم ہنڈرڈ ہاؤس (USH) ٹورانٹو، کینیڈا

مادی سائنسوں امت اسلامیہ کا زوال وہ مفروضہ داستان غم ہے جو اگناک (اضحاک یہودا) گولڈ زیہر اور برنارڈ لوئس کے طعن وطنز سے شروع ہوکر انہی جیسوں کے بنائے ہوئے مغربی نظام تعلیم کے آفریدہ اور پروردہ مسلمانوں کے نوحوں اور ملامتوں تک یوں پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا نقطۂ انتہاء غالب کی تمنا کا دوسرا قدم بن کر رہ گیا۔

مریخ پر پانی کی کھوج کے بعد دنیا کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں صرف مسلمان ہی کیوں اچانک مادی سائنسوں کو طلاق دے کر بیٹھ رہے۔ دنیا کی شائد ہی کوئی یونیورسٹی ہو جہاں اس فکرمندی کے ثبوت میں اسلامک سٹڈیز کے عنوان سے شعبے قائم نہ ہوں اور جہاں دو سو یا تین سو سال سے یہ مسئلہ ہر اہم اور غیر اہم شخص کی قلم کاریوں کا ہدف نہ بنا ہو، اور جہاں یہ فیصلے صادر نہ کئے جارہے ہوں کہ کمزوری کہیں خود اسلام ہی میں تھی، ورنہ سائنس تو ہر در کا کتا ہے۔ حیرت ہے کہ کوئی نہیں پوچھتا کہ پچھلے دو ہزار سال میں یونان نے کوئی دوسرا سقراط، بقراط، جالینوس اور فیثاغورث کیوں پیدا نہیں کیا اور کیا یہ ثابت نہیں کردیا کہ اس ناکام یونانی تہذیب کے اندر کوئی ایسا عیب اور جہل کا عنصر تھا یا معاشرتی دماغی فتور کہ ایک اتفاقی حادثہ کے بعد علم وفکر وہاں سے اردو شاعری کے محبوب کی کمر کی طرح غائب ہوگیا۔ کوئی فکر نہیں کرتا کہ رومن امپائر کے انتقال بے ملال کے بعد اٹلی کو دوسرا جولئس سیزر میسر نہ آیا تو کیا ثابت نہ ہوا کہ اٹلی میں کوئی اندرونی معاشرتی خرابی ضرور تھی کہ دوبارہ ایسا شخص اسے نہ مل سکا۔ کسی کے منہ میں زبان حرکت نہیں کرتی کہ پانچ ہزار سال پہلے مصر میں اہرام اور الاقصر، ابوسمبل اور کرناک کے مندر جیسے عجائبات بنانے والی قبطی قوم سائنس اور ٹکنولوجی کے میدان سے اچانک غائب ہوگئی تو کیا ان قبطیوں کے دماغوں میں کوئی ایسی خرابی پیدا ہوگئی تھی کہ وہ آج نیل کے ساحل پر ریت کے گھروندے بنانے کے قابل بھی نہ رہے۔

تاریخ میں ایسے دسیوں سوال ہیں جن پر کوئی عمریں لگاتا ہے نہ کتابیں لکھتا ہے، نہ انہیں حل کرنے کے لئے دنیا کی ہزاروں یونیورسٹیوں میں نام دے دے کر تعلیمی شعبے قائم کئے جاتے ہیں۔ یہ ستم افزائی

صرف مسلمانوں کی خاطر ہے۔

راتی حد تو ہرگز نبود صحبت ما
بس اگر بر سرایں کوئے گئی سگ بانی

سچ یہ ہے کہ یہ سوال اس لئے نہیں کئے جاتے کہ ان کا علم سے کوئی تعلق ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں جو لوگ ایسے سوالات اٹھاتے ہیں علم سے ان کی وہی نسبت ہے جو ہاتھی کو اپنے دسترخوان پر مدعو کرنے والی چیونٹی کو ہاتھی کے باورچی خانہ سے ہوگی۔ ان دماغوں پر علم کی حقیقت نہیں کھل سکی۔

علم، معاشرہ اور قانون

علم انسان کا ذاتی کمال نہیں ہے اور نہ علم کے کسی شعبہ میں کمال حاصل کرنا ہر انسان اور ہر قوم پر واجب ہے۔ علم تو ایک ربانی انعام ہے جو مادی اور روحانی دونوں سمتوں سے دارین میں زندگی کو سہل اور مفید اور خوشگوار بنانے کی غرض سے انسان کو بقدر رحمت اوست عطا کیا گیا ہے۔ علم بطور ایک صلاحیت کے فرد کی فطرت میں موجود ہے۔ فرد اپنے زوج کے ساتھ معاشرہ بناتا ہے۔ معاشرہ قانون کا تقاضا کرتا ہے۔ قانون کا منبع بھی وہی ہے جو علم کا ہے کیونکہ قانون خود علم ہی کی ایک شاخ ہے۔ یہ ہے وہ مدار جس پر معاشرہ کی کہکشاں گردش کرتی ہے۔ نہ ہر کہکشاں میں ہر سورج یکساں حجم کا ہوتا ہے، نہ معاشروں میں پانچوں انگلیاں برابر ہوتی ہیں اور نہ قانون ہر عمل کی جزا و سزا میں یکسانیت کا قائل ہوتا ہے۔

قرآن حکیم کے آغاز ہی میں تمام نوع انسان پر یہ واضح کردیا گیا ہے کہ انسان اول کو خلافت ارضی عطا فرمانے کے اعلان کے ساتھ بطور دلیل پہلے حقیقت اسماء واشیاء کے عنوان سے مادی علم دیا گیا تھا (وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا - البقرہ ۲:۳۰ = اور آدم کو تمام اشیاء کے ناموں کا علم دے دیا)، مگر چونکہ مادیات کا علم اپنے مزاج سے ایک حصان بادیہ، اسپ وحشی اور رخش بے عناں ہے تو اس کو لگام بند کرنے کے لئے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام دونوں کو بیک لمحہ قانون یا شریعت، یعنی امر و نہی، جائز و ناجائز، مباح و ممنوع کا علم دیا گیا: وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا [ص] وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ٥ البقرہ ۲:۳۵ = اور ہم نے حکم دیا کہ اے آدم تم اور تمہاری زوجہ جنت میں رہو اور دونوں اس میں سے جہاں سے جی چاہے اور جو جی چاہے جتنا چاہے کھاؤ، مگر دیکھو اس شجر کے قریب بھی نہ جانا، ورنہ اپنی جانوں پر ظلم کرو گے۔

اس دوسری آیت مبارکہ میں امر و نہی، جائز و ناجائز، حلال و حرام دونوں کا علم کل معاشرہ، یعنی آدم و

حوا دونوں کو ساتھ ساتھ دے دیا گیا تھا. کیا کرنا ہے یہ بھی واضح کر دیا گیا تھا اور کیا نہیں کرنا ہے اس کی نشان دہی بھی کر دی تھی. یہ جنت کا قانون تھا. دنیاوی اسلامی اصطلاح میں اسی کو شریعت کہا جاتا ہے. سادہ زبان میں قانون یا شریعت کا منشاء انسان کو نفع نقصان، مفید و مضر، جائز و ناجائز، حلال وحرام، مباح و مکروہ سے باخبر کرنا اور ایک ایسے دائرۂ عمل کا تعین کرنا ہے جس کے اندر آدمی محفوظ اور کارآمد زندگی گزار سکے. اس عرفان کے بغیر انسان کسی بھی نوع کے علم سے از خود مستفید نہیں ہو سکتا بلکہ شدید نقصان اٹھاتا ہے. انسان کی تاریخ اس کی گواہ ہے.

علم کی اس حقیقت کو سمجھے بغیر عہد رواں میں علم کو انسان کا ایک ایسا مشروط بنیادی حق باور کر لیا گیا ہے کہ پیسہ جیب میں ہو تو اسے بازار سے خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہو تو حق کا بنیادی تقاضا سوخت ہو جاتا ہے. یہ علم سکول، کالج اور یونیورسٹی میں حاصل کیا جاتا ہے. مادی علوم کی حقیقت، اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں، لیکن اختراعی صلاحیت کے اظہار کی سند صرف یونیورسٹی کی ڈگری نہیں ہوتی. عجیب بات ہے کہ بے علم تصور کیا جاتا ہے وہ بچہ جو تدریب کے مراحل سے گزر کر بڑی مہارت اور نفاست سے قالین بافی کرتا ہے، وہ فن شناس جو عمدہ نرم اور گرم کپڑا بنتا ہے، وہ کاریگر جو خوبصورت اور نازک زیورات گڑھتا ہے. اس پس منظر میں تمام حرفتوں پر خط تنسیخ کھینچ کر عام طور سے علم سے مراد تصوری یا تجربی مادی علم ہوتا ہے اور اسی کے وجود وعدم کے پیمانوں پر قوموں کی معاشی اور معاشرتی درجہ بندی کرنے کا رواج پڑ گیا ہے. مسلمانوں کا ایک طبقہ اسی پیمانے پر امت مسلمہ کی استعداد کو آنکتا ہے اور اپنے منطقی نتائج میں مسلمانوں کے ادبار اور پسماندگی کے اسباب سے بحث کرتا ہے.

مادی علوم میں امتوں کا موازنہ

عہد رواں میں اس نہج پر سوچنے والے کچھ مسلمانوں میں یہ تکلیف دہ احساس پایا جاتا ہے کہ دیکھو یہودیوں اور عیسائیوں کو اتنے بہت سے نوبیل انعامات ملتے ہیں مگر ان ممتاز سائنسدانوں میں مسلمان نظر نہیں آتے. ان اہل دانش کی دانست میں اس کی وجہ وہی جدید یا مغربی یا مادی علوم میں مسلمانوں کی پسماندگی ہے. یہ بھی کوئی نیا خیال نہیں ہے. اس کی جڑیں یورپی استعمار کے فلسفۂ عمل میں ڈیڑھ دو سو سال سے پیوست ہیں. سر دست یہ موضوع گفتگو نہیں ہے، بلکہ فطری اور کسی درجہ میں معاشرتی سائنسوں میں مسلمانوں کی پسماندگی کا شکوہ مورد توجہ ہے.

اس مسئلہ کے دو جوابات ہیں. ایک الزامی اور دوسرا معروضی. الزامی جواب یہ ہے کہ مسلم دنیا میں

سیکڑوں ہزاروں یونیورسٹیاں کھلی پڑی ہیں جن میں مسلمان ہی اقتصادیات، کیمیا، طبعیات اور طب مغرب وغیرہ کی تعلیم دیتے اور حاصل کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ گزشتہ نصف صدی کے دوران لاکھوں نہیں تو ہزارہا مسلمان اعلیٰ تعلیم کے لئے شمالی امریکہ اور یورپ کے مادی ترقی یافتہ ملکوں میں جابسے اور وہاں کی یونیورسٹیوں سے انہی مادی علوم میں اونچی ڈگریاں حاصل کئے بیٹھے ہیں۔ انہیں کس نے کوئی نوبیل انعام حاصل کرنے سے روک رکھا ہے۔ یہ بہترین اور تجربہ کار دماغ اگر اس انعام کے حقدار نہیں مانے جاتے تو اس کی کوئی وجہ ہوگی: یا تو علمی اعتبار اور تحقیقی معیار سے ان میں اس انعام کی اہلیت ہی نہیں ہے یا پھر یہ ان کے ملی تشخص کا مسئلہ ہے جس سے مسلمان عموماً لاعلم ہیں یا اس معاملہ میں معروضی گفتگو سے بوجوہ اجتناب کرتے ہیں۔ اہلیت کی بات قابل قبول نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ دیگر اقوام کچھ زیادہ ہی لائق و فائق اور ذہین و فطین ہیں اور مسلمان نرے نااہل اور نکمے اور بے عمل اور بے شعور ہیں۔ چنانچہ دوسرا نکتہ غور طلب ہے۔

اس سوال کے معروضی جوابات دو ہیں۔ اول یہ کہ واقعہ ایلاء کے سلسلہ میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت سے حضرت عمرؓ کی ایک طویل حدیث میں آتا ہے کہ فرمایا جب وہ رسولؐ اللہ کے گھر میں تشریف لے گئے تو "میں نے آنکھ اٹھا کر گھر کا جائزہ لیا۔ اللہ گواہ ہے کہ گھر میں تین چیزوں کے سوا کوئی ایسی شے نہیں دیکھی جس پر نظر ٹکتی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ، دعا فرمائیں کہ اللہ آپ کی امت کو ویسی فراخی عطا فرمائے جو فارس اور روم کی قوموں کو حاصل ہے۔ انہیں دنیا عطا کی گئی ہے حالانکہ وہ عبادت گزار نہیں ہیں۔ رسولؐ اللہ ابھی تک ٹیک لگائے بیٹھے تھے لیکن اب سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا: ابن خطاب، تمہاری نظر میں بھی یہ چیزیں اہمیت رکھتی ہیں۔ یہ تو وہ لوگ ہیں جنہیں جو بھلائی ملنے والی تھی سب اسی دنیا میں دے دی گئی"۔ (امام بخاری۔ جامع الصحیح : تفہیم البخاری ۳:۹۷ح ۱۷۴)۔

عہد رسالت میں جو درجہ فارس اور روم کا تھا آج اسی مقام پر مغرب کے یہودی اور عیسائی ہیں۔ البتہ مشرقی ملکوں میں رہنے والے عیسائی اور یہودی نوبیل اعزاز کے مستحق نہیں سمجھے جاتے۔

نظام فطرت کے خلاف عمل

سائنس اور ٹکنولوجی میں مسلمان مغرب کے یہود و نصاریٰ کی مانند کیوں نہیں کا دوسرا معروضی جواب

یہ ہے کہ دیگر اقوام کی نسبت اسلامی فطرت کے زیر اثر مسلمانوں میں ملی حیثیت سے قانون کی اطاعت کا مادہ زیادہ ہے جو اطلاقی مادیات (applied material sciences) میں نسبتاً غیر مفید ہے۔ ایجادات میں ایک قسم کی قانون شکنی اور فطرت سے چھیڑ چھاڑ کا پہلو ہوتا ہے۔ مثلاً آکسیجن اور ہائیڈروجن دو آزاد ہوائیں ہیں جن کی آمیزش سے پانی بنتا ہے مگر اس عمل میں دونوں ہواؤں کی اصل ماہیت باقی نہیں رہتی، دونوں کا اپنا فطری وجود ختم ہو جاتا ہے۔ سادہ مادی یا سائنسی کلیہ ہے کہ قدرتی تخلیق میں ردو بدل کئے بغیر کوئی نئی ایجاد ممکن نہیں ہوتی۔ کوئی نئی چیز بنانے کے لئے کسی قدرتی نظام کو تہہ و بالا اور شکست کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کائنات کے فطری نظام سے ٹکراؤ یا اشیاء کی اصل ماہیت میں الٹ پھیر علوم مادیات میں ترقی کے لئے ضروری ہے۔ دو ہواؤں سے پانی بنالینا ہر انہیں، مگر انسان نے سائنس کی مدد سے کوئی سمندر تو کجا ایک تالاب یا ایک پیالہ پانی بھی نہیں بنایا۔ کسی بات کا جاننا اور بات ہے اور اس کا تجربہ دیگر شے ہے۔ انسان یونہی پانی بنانے کا اہل ہوتا تو خشک و بے آب و گیاہ مریخ پر اب تک سمندر بہا چکا ہوتا اور نظام قدرت سے وہاں پانی کی بھیک نہ مانگ رہا ہوتا۔

دوسری جانب عہد رواں میں انسان نے ایسی بے شمار ایجادات کی ہیں جن کے مفید عمومی فائدہ سے تو کلیتاً انکار نہیں، لیکن ان کی مطلق مضرتیں نسبتاً زیادہ ہیں جو فطرت سے بغاوت اور نظام قدرت میں انسان کی بے محابا دست اندازی اور بلا روک ٹوک تخریب و تبدیلی کا نتیجہ ہیں۔

درست ہے کہ تمام مادی ایجادات مضر ہی نہیں ہوتیں، مگر پھر انہی جدید نوبل انعام یافتہ ایجادات کے مضر اثرات (side-effects) کے نوحوں سے ابلاغیہ میں خبروں کے متن، ٹیلیوژن قناتوں پر لنگروں کے واویلے اور عالمی کانفرنسوں میں محققوں کے مقالے بھرے پڑے ہیں۔ اکثر جدید ایجادات پر شراب کی آیت (البقرہ ۲:۲۱۹) منطبق ہوتی ہے کہ ان کے نقصانات بہت ہیں اگرچہ کچھ فائدے بھی ہیں۔ مثالیں اتنی ہیں جتنی نئی ایجادات۔ بات سمجھنے کے لئے صرف چند کا اجمالی ذکر کافی ہے۔

امراض سازی کی صنعت

عصر حاضر میں مادی ایجادات کی ایک خصوصیت مرض آفرینی ہے۔ اکثر نئی ایجادات نقصان رساں اور پیچیدہ امراض پیدا کرنے والی ہیں۔ ہمارے اس زمانہ کے نفسیاتی اور بدنی عوارض کی کثرت اور آئے دن نت نئے امراض کی خبریں اس کی دلیل ہیں۔ بیسویں عیسوی صدی میں دنیا کی دو مہیب ترین جنگوں

میں مجموعی طور پر تقریباً ۱۴ کروڑ انسانوں - فریقین کے لڑاکوں اور نہتے معصوم شہریوں - کو مجموعی طور پر یورپی قوموں نے صرف دس سال کی قلیل مدت میں مجنونانہ طریقہ سے لقمۂ اجل بنادیا تھا جن کی غالب اکثریت بے ضرر بوڑھوں، عورتوں، بچوں کی تھی: اوسطاً سالانہ تقریباً ڈیڑھ کروڑ (۱۴ ملین) انسانوں کا قتل عام تھا جس پر آج تک کوئی شرمندہ نہیں ہے۔ ان کے علاوہ بیسویں صدی میں آٹھ کروڑ (۸۰ ملین) سے زیادہ عام شہری مختلف ملکوں میں ہونے والے قتل عام، نسل کشی اور برادر کشی کی منصوبہ بند مہموں اور کسی دیگر مقام پر سوچی سمجھی علاقائی جنگوں میں مارے گئے۔ پوری معلوم انسانی تاریخ میں ایک صدی کے دوران اتنے انسان پہلے کبھی انسانی وحشت وظلم کا شکار نہیں ہوئے۔

یہ جو کچھ ہوا سب بے مہار مادی ایجادات ہی کا نتیجہ تھا، خواہ جنگی ہتھیاروں کے ذریعہ ہو یا مادی ترقیات اور جنگوں کے پیدا کئے ہوئے لاعلاج نفسیاتی عوارض کی وجہ سے اخباری اطلاعات کے مطابق افغانستان، عراق اور شام کے محاذوں سے واپس آنے والے کم عمر امریکی اور کینیڈائی سپاہیوں کی ایک قابل لحاظ تعداد بدنی اور نفسیاتی اور دماغی امراض کی شکار ہے۔ بے خوابی کے شکار ان ذہنوں پر طاری دہشت کا کوئی علاج جدید طب اور سائنس میں نہیں ہے۔ ان غریبوں کی مصیبت کی خبروں کو ابلاغیہ میں کوئی بہت نمایاں جگہ نہیں دی جاتی۔

گزشتہ صدی کے دوران دنیا میں امراض میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ عام مشاہدہ کی بات ہے کہ اب سے پچاس ساٹھ سال پہلے تک صرف بڑے شہروں یا ضلع کے صدر مقام میں اوسط درجہ کا ایک سرکاری ہسپتال ہوتا تھا جہاں تعینات ایک تجربہ کار سرجن سنگین امراض کا علاج کر دیتا تھا۔ باقی عام لوگوں کی صحت کی دیکھ بھال قصبوں، محلوں اور گلیوں میں بیٹھے ہوئے ڈاکٹر یا حکیم یا وید کر لیتے تھے۔ پیچیدہ امراض کا وقوعہ شاذونادر ہوتا تھا اس کے برعکس آج چھوٹے شہروں اور قریوں میں بھی نجی زمرہ میں کئی کئی منزلہ عظیم الشان ہسپتال قائم ہو چکے ہیں جن کی تجارتی درجہ بندی او نچے پنجتارہ ہوٹلوں کے معیار پر کی جاتی ہے۔ ان میں مریضوں کی کثرت دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ شہر میں شائد ہی کوئی صحت مند شخص رہ گیا ہے۔ ہر اہم شہر میں کئی کئی بڑے بڑے خصوصی ہسپتال کروڑوں ڈالر/روپے کی لاگت اور مالیت والی اور سالانہ بھاری نفع کمانے والی بڑی گردن کش تجارت بن چکے ہیں جن کا اخلاقیات سے کوئی تعلق باقی نہیں رہا۔ بہت سے بڑے ہسپتال کسی خاص سنگین مرض کے علاج کیلئے خاص ہیں۔

کینیڈا کے ایک نوجوان مسلم ڈاکٹر سے ایک بار پوچھا گیا کہ سنا تھا ڈاکٹری کی سند لیتے ہوئے نئے ا

طباء کو بقراط کے عہدنامہ کا حلف لینا پڑتا تھا کیا میڈیکل کالجوں میں یہ رسم آج بھی باقی ہے؟ کچھ تأمل کے بعد جواب ملا: عہدنامہ اور حلف وغیرہ تو کچھ نہیں ہوتا، آج کے ڈاکٹروں نے تو شائد بقراط کا نام بھی نہ سنا ہو۔ یہ اس یونان پر معلومات کا حال ہے جسے گولڈز یہری علاے موجودہ یورپی ترقی کا واحد سبب فرماتے ہیں۔ اس عہدنامۂ بقراط کی رو سے شریف فن طب کو مال کمانے اور زراندوزی کا ذریعہ بنانے کی ممانعت تھی اور دکھی انسانیت کے ساتھ ہمدردانہ سلوک اور ایثار و قربانی کا وعدہ کرنا پڑتا تھا۔ آج کا ماہر سرجن اور عام طبیب مریض کی "مشاورتی تشخیص" کے بعد اپنے شاندار مطب کے بیرونی کمرہ میں بیٹھی ہوئی سیکریٹری کی معرفت کسی سنگین مرض کے شکار شخص سے اس مشاورتی ملاقات کی فیس وصول کرنے کے بعد پہلے مفروضہ مکمل علاج کی لاگت کی باضابطہ اطلاع دلواتا ہے جس میں دواؤں کا خرچ شامل نہیں ہوتا۔ اس طلاع کے بعد مریض کو بازار کے عام خریدار کی طرح اختیار ہے کہ خصوصی ڈاکٹر کی اس دکان پر مطلوبہ قیمت زیادہ لگے تو مارکیٹ میں کسی اور دکان سے اسی طرح صحت بھی خرید لے جیسے میز کرسی اور گوشت یا لک خریدتا ہے۔ ایسی احادیث موجود ہیں جن میں آخرزمانہ میں کثرت مال اور افراط زر کو امت مسلمہ کا فتنہ اور قیامت کی ایک عالمی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

مسلم سائنسدانوں کی پہلوتہی

امراض اور مریضوں کی اس کثرت کا کوئی سبب ضرور ہوگا جس پر کسی ادارہ نے غور و تحقیق کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ سچ پوچھا جائے تو دنیائے علم کو فطرت کی حاکمیت کی طرف واپس لانے کی غرض سے ایسی تحقیقات اور تجزیے ان مسلمان سائنسدانوں کا حق ہیں جو غیرمبہم قرآنی حکم و ہدایت کے بموجب مادی علوم کو روحانی علوم کی تحت نگرانی میں رکھنے کے قائل ہوں۔

امراض کی کثرت کا ایک بدیہی سبب نئی ادویات ہیں۔ ادویات کی دنیا میں ایجادی انقلابات آرہے ہیں اور ان ہی نئی اشتہاری دواؤں کے استعمال سے ذیلی بیماریاں اور عارضے (side-effects) پیدا ہورہے ہیں جو کبھی کبھی لاعلاج ثابت ہوتے ہیں۔ کون نہیں جانتا کہ اس زمانہ میں جانوروں اور انسانوں میں ایسے ایسے امراض پیدا ہوگئے ہیں جن کا کبھی نام بھی نہیں سنا گیا تھا۔ یہ اطلاع بھی آثار قیامت کی ایک حدیث میں انسانوں کو دے دی گئی تھی۔

دواؤں کے مضر صحت اثرات کے علاوہ بھی حسن کاری کی مصنوعات اور روزمرہ کی غذاؤں تک میں دانستہ ایسے اجزا شامل کئے جاتے ہیں جو صحت کو شدید نقصان پہنچانے والے ہوتے ہیں۔ مغربی ملکوں میں

آئے دن ایسے سرکاری اور نیم سرکاری اعلانات آتے رہتے ہیں جن میں حسن افزا سامان یا غذائی اشیاء کے اجزائے ترکیبی کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے. کبھی خود مشہور کمپنیاں اپنی کسی مصنوعہ کو واپس لینے کا اعلان کردیتی ہیں جس کا عام اثر دیکھنے سننے میں نہیں آتا. کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ہی مضر صحت ترکیبی جزو کو نام بدل کر استعمال کرلیا جاتا ہے. اکثر یہ نئے نام عام آدمی کی سمجھ سے بالا ہوتے ہیں. یہ لاطینی الفاظ یا انگریزی کے حروف واعداد کی شکل میں ہوتے ہیں.

کچھ ملتی جلتی حالت تھی جب عذاب سے پہلے آل ابراہیمؑ کی شاخ بنی قطورا کے نبی حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو ہدایت کی تھی کہ دیکھو پورا ناپا کرو، خریداروں کا نقصان مت کیا کرو، سیدھی ترازو تولا کرو، لوگوں کی چیزوں میں وزن کم مت کیا کرو اور زمین پر فساد نہ پھیلاؤ (الشعراء۲۶: ۱۸۱-۱۸۳).

آج جو افراد اور ادارے ان عارضوں کا سبب بن رہے ہیں تو اس لئے کہ ان کے سامنے مسند شعیبؑ خالی ہے اور اتفاقاً کوئی چھوٹا موٹا آدمی فہمائش اور تہدید کرے کہ زمین پر فساد نہ پھیلاؤ اور اپنی بدعملیوں سے باز آجاؤ تو جواب اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ، لو بھلا، ایک ہم ہی تو دنیا کو سنوارنے والے ہیں (البقرہ ۲: ۱۱/ مولانا ابوالکلام آزاد. ترجمان القرآن ۱: ۱۷۸).

بے مہار مادیات کی مضرتیں

سابق صدر امریکہ براک اوباما نے جنوری ۲۰۱۶ء کے آغاز میں ایک وفاقی قانون منظور کیا جس کے تحت امریکہ میں بننے والے مشہور عالم مارکوں کے ٹوتھ پیسٹ، ماؤتھ واش، منہ ہاتھ دھونے اور غسل کے صابن اور مردانہ و زنانہ میک اپ کی کچھ مصنوعات پر پابندی عائد کی جائے گی تاوقتیکہ وہ "مضر" اجزا کو ترکیب سے خارج نہ کریں. کئی امریکی ریاستوں میں بعض نامور مارکوں کی چند مصنوعات کے خلاف پہلے ہی ایسے قانون نافذ ہو چکے ہیں. ان قوانین کے زیر اثر ٹوتھ پیسٹ، ماؤتھ واش، ہر قسم کے صابن اور حسن کاری کے سامان بنانے والے دو ایک عالمی شہرت یافتہ اداروں نے ابلاغیہ میں اعلان کیا ہے کہ وہ اپنی مصنوعات میں متعلقہ مضر اجزا کے استعمال میں کمی کر رہے ہیں: یعنی ان مضر اجزا کی مقدار کم کردی جائے گی، ان کا استعمال ترک نہیں کیا جائے گا. کبھی کبھی یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جب مغربی ملکوں میں کسی مصنوعہ پر سختی سے پابندی عائد کردی جاتی ہے تو موجودہ زمانہ کے ایک مروجہ عالمی تجارتی اصول کے مطابق یہ مضر اشیاء اور مرض افزا مصنوعات افریقہ اور ایشیا اور جنوبی امریکہ ملکوں میں برآمد کردی جاتی ہیں، اور اشتہاری مہموں کے ذریعہ وہاں ان کی کھپت میں اضافہ ہو جاتا ہے. وہاں نہ تو کسی کو ان اشیاء کی

معلوم اور مصدقہ مضرتوں کا کوئی اندازہ ہوتا ہے، نہ مقامی حکمران حفاظتی قانون بنانے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔اس عدم دلچسپی کے اسباب بتانے ضروری نہیں۔

خبروں کے مطابق اوباما قانون کے ماتحت امریکہ میں غیر قانونی قرار دیئے جانے والے مضر صحت ٹوتھ پیسٹ، ماؤتھ واش، صابنوں اور چہرے، ہاتھوں اور بدن پر استعمال کے میک اپ کی کریموں اور لوشنوں اور پاؤڈروں وغیرہ میں باریک پسے ہوئے شیشے کا پاؤڈر اور پلاسٹک کے بہت مہین دانے (microbeads) استعمال کئے جا رہے ہیں جن کی کوئی خبر صارفین کو نہیں ہوتی۔ایسے اجزا کی وجہ سے ایک طرف ان اشیاء کو استعمال کرنے والوں میں کینسر کے مرض کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف ایک اخباری اطلاع کے مطابق نیویارک سٹیٹ میں واقع جھیل ایری (Erie) میں لاکھوں کی تعداد میں یہ مہین دانے بدرونالیوں کے ذریعہ پہنچ کر اس جھیل کے بعض حصوں میں پانی کو انسانوں اور جانوروں کے لئے ناقابل استعمال اور مچھلیوں کے لئے نقصان دہ بنا چکے ہیں۔انسانی غذا میں ان مچھلیوں کا استعمال مزید امراض پیدا کرتا ہے۔اسی جھیل ایری کا پانی نیاگرا آبشار کی صورت میں جھیل اونٹاریو میں گرتا ہے جو شرقی کینیڈا اور امریکہ کی حد فاصل ہے۔پھر یہی آلودہ پانی کئی امریکی اور کینیڈائی شہروں اور قصبوں سے گزرتا ہوا رود لارنس کی راہ سے بحر اطلس میں اتر جاتا ہے۔قانون تو بن گیا اور قانون بنتے رہتے ہیں، لیکن نہ جانے پچھلے کتنے برس میں بے رحم مادی علوم کے بے محابا استعمال سے انسانوں اور جانوروں کو جو نقصان پہنچ چکا ہے اس کا ازالہ نہ ہوا ہے، نہ ہوگا اور نہ کسی کو اس کی پرواہ ہے۔

یاہو نیوز پر رائٹر ایجنسی کی ایک تازہ خبر (۲۴ فروری ۲۰۱۶ء) ہے کہ امریکہ کی ریاست مزوری (Missouri) کی ایک عدالت نے بچوں کے پاؤڈر اور شیمپو بنانے والی ایک مشہور عالم بین الاقوامی کمپنی پر ۷۲ ملین (سات کروڑ بیس لاکھ) ڈالر کا ہرجانہ اور جرمانہ عائد کیا ہے۔استغاثہ کے وکلا کے مطابق کمپنی پر الزام تھا کہ ایک عورت ۳۵ برس تک اس کمپنی کا بنایا ہوا کا پاؤڈر استعمال کرنے کے بعد کینسر سے مر گئی تھی کیونکہ کمپنی نے اجزائے ترکیبی کے سلسلہ میں یہ واضح نہیں کیا تھا کہ اس پاؤڈر کے ایک جزو سے کینسر ہو سکتا ہے۔عدالت نے مرنے والی کے لواحقین کو ہرجانہ کے طور پر دس ملین (ایک کروڑ) ڈالر ادا کرنے کا حکم دیا اور بطور سزا کمپنی پر ۶۲ ملین (چھ کروڑ بیس لاکھ) ڈالر کا جرمانہ عائد کیا۔اصل مسئلہ یہ مقدمہ یا ہرجانہ و جرمانہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ اس خبر کے مطابق بھی دواؤں اور سامان حسن کاری

میں ایسے مضر اجزا استعمال ہو رہے ہیں جن کا طویل مدتی استعمال مرض آفریں اور مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

نفسیاتی ہیجان کے مادی اسباب

اس مادی ترقیاتی مسئلہ کا ایک اور مختلف رخ نگاہوں سے قطعی اوجھل ہے اور اس پر کوئی تحقیق ہے نہ اس سلسلہ میں کوئی قانون بنتا ہے۔انسان نے زمین سے تیل نکالا، اسے صاف کر کے گھر کے چولھے اور چراغ جلا دئے ،موٹر کاروں، ٹرینوں اور ہوائی جہازوں کو رواں کر دیا، شہروں کو بجلی سے روشن کر دیا، لیکن فضا میں اتنی آلودگی بھی پیدا کر دی کہ نتیجہ میں بے شمار جی- خاص طور سے سینہ اور تنفس کی- بیماریاں پیدا ہو گئیں۔

ایک امریکی ادارہ کی میزان کے مطابق ۲۰۱۰ء میں ایک ارب سے زیادہ کاریں، بسیں اور چھوٹے، متوسط اور بھاری ٹرک دنیا بھر میں سڑکوں پر دوڑ رہے تھے۔جو کاریں اور ٹرک وغیرہ کسی وجہ سے استعمال میں نہیں تھے مگر قابل استعمال تھے ان کی تعداد اس کے سوا تھی۔سڑکوں پر ان گاڑیوں کی عام رفتار ۴۰ سے ۱۲۰ کیلو میٹر فی گھنٹہ ہوتی ہے۔یہ تمام گاڑیاں اسی تیل کے دم سے چلتی ہیں۔ان کے علاوہ دنیا بھر میں ایک دن کے ۲۴ گھنٹے میں اوسطاً پچاس ہزار مسافر ٹرینیں اور مال گاڑیاں پٹریوں پر گڑگڑاتی رہتی ہیں، ان میں سے دس ہزار مسافر ٹرینیں صرف ہندستان میں ایک دن میں پٹریوں پر چلتی رہتی ہیں۔ان ٹرینوں کی لمبائی پانچ مسافر ڈبوں سے بیس ڈبوں تک ہوتی ہے دو سے تین کیلو میٹر لمبی ہزاروں مال گاڑیاں ہزار ہا ٹن سامان لادے روزانہ زمین کے سینے پر دندناتی رہتی ہیں۔یہ بھی سب اسی تیل کا کرشمہ ہے۔

تیل کے استعمال سے پیدا ہونے والی فضائی آلائش میں اضافہ کے علاوہ یہ کاریں، بسیں ٹرک اور ٹرینیں سطح زمین پر بظاہر غیر محسوس اور خفیف اضطراب اور ارتعاش پیدا کرتی ہیں۔ایک اور نکتہ جو علمی تحقیق و تبصرہ اور طبیعیاتی گوشواروں کا محتاج ہے یہ کہ اندازہ کے مطابق عہد رواں میں زلزلوں کا سالانہ وقوعہ بڑھ گیا ہے۔کچھ عرصہ پہلے ایک خبر یہ بھی آئی تھی کہ اپنے محور پر زمین کے جھکاؤ کے زاویہ میں سالانہ چار چھ سینٹی میٹر کا فرق پڑ رہا ہے۔ممکن ہے سطح زمین اور جوف زمین میں بڑھتا ہوا یہی اضطراب اور غیر قدرتی اضافی حرکت زمین کے محوری زاویہ میں فرق اور زلزلوں کی کثرت کا ایک بڑا سبب ہو۔قیامت کے قریب یوں بھی متواتر زلزلوں کی کثرت کی حدیثی پیشگوئی موجود ہے(جامع ترمذی ۱:۸۰۹/ ح ۲۰۳۳)۔

ہمہ قسم زمینی گاڑیوں کا قصہ الگ رہا۔سطح زمین سے بلند ہوں تو ایک اندازہ کے مطابق وقت کے کسی بھی ایک لمحہ میں اوسطاً دس ہزار مسافر ہوائی جہاز سات سو سے نو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے فضا

میں اڑتے رہتے ہیں. یعنی ہر ۲۴ گھنٹے کے کسی بھی لمحہ میں فضاء میں موجود طیاروں کی اس تعداد میں کوئی نمایاں فرق نہیں پڑتا. یہ طیارے زمین پر ہوا کے غلاف میں مسلسل تموج پیدا کرتے ہیں. یہ طیارے ہوا کے قدرتی بہاؤ میں خلل ڈالتے ہوں تو کیا حیرت. یہ تو مسافر طیاروں کا ذکر ہوا. سامان بردار بڑے طیارے اور ۱۹۳۹ء سے آج تک مسلسل بلا انقطاع جاری بڑی چھوٹی جنگوں میں استعمال ہونے والے فوجی طیارے ان کے علاوہ ہیں. ان ہزاروں چھوٹے بڑے ہوائی جہازوں کے ساتھ، ہیلی کوپٹر، نیز جارحیت کے شکار اور جنگوں میں مبتلا ملکوں میں دن رات اڑنے والے ڈرون اور ہوائی کمپیوٹری بم فضائے ارضی میں مزید ارتعاش پیدا کرتے رہتے ہیں. تحقیق تو نہیں ہے مگر قیاس ہے کہ موجودہ زمانہ میں خصوصاً امریکہ میں آنے والے گرد باد اب طوفانوں کا ایک سبب زمین کے نظام ہوا میں ہر لمحہ جاری یہ فساد بھی ہو سکتا ہے. یاد رہے دنیا میں سب سے زیادہ ہوائی سفر امریکہ میں کیا جاتا ہے اور سب سے زیادہ طوفان باد و باراں (tornadoes اور hurricanes) بھی اسی سرزمین پر آتے ہیں.

ہوا کو طیش میں لانے والے کام

زمینی فضا میں فساد کا ایک اور ذریعہ بھی پیش نظر رہے. جہاں ایک طرف برق رفتار کاریں، ٹرک، ٹرینیں اور ہوائی جہاز ہوا کو بے قرار کر رہے ہیں ٹھیک انہیں لمحات میں دنیا بھر میں لاکھوں ریڈیو سٹیشن، ٹیلیوژن سٹیشن، کروڑوں زمینی ٹیلیفون، سیل فون اور انٹرنیٹ/وائی-فائی کے مواصلاتی نظام فضائے عالم کو ریڈیائی اور ٹیلیوائی صوتی اور صوری لہروں سے متاثر کر رہے ہیں اور یہ کام بھی چوبیس گھنٹے مدام جاری رہتا ہے. ان تمام مادی حرکات سے ہوا میں پیدا ہونے والا مقناطیسی طوفانی تموج انسانوں کو کس طرح متاثر کر رہا ہے اس کا کوئی اندازہ کوئی سائنسداں پیش نہیں کرتا. کبھی اس کا کچھ ذکر بھی ہو تو فقط ماہرین کے زیر مطالعہ آنے والے خصوصی پیشہ ورانہ مجلّات کی تکنیکی زبان سے باہر نہیں آتا کہ عام آدمی کو ان باتوں کی خبر ہو. اور خبر ہو بھی جائے تو وہ بیچارہ کیا سمجھ لے گا اور کیا کر لے گا.

ایک قدرتی نظام کے مطابق ہزاروں سال سے ہوائیں اپنے اپنے متعین راستوں پر چلتے ہوئے ساری دنیا کے بر و بحر کو پیام نشاط دیتی رہتی ہیں. انہیں تکلیف پہنچانا ایسا ہی ہے جیسے کسی جاندار کو بار بار کچوکے لگانا. حضرت ابیؓ ابن کعب سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک انداز میں ہوا کو برا کہنے سے روکا ہے. **لَا تَسُبُّوا الرِّيحَ** = ہوا کو گالی مت دو (جامع ترمذی ۲:۶۸/ح ۲۷). جسے برا کہنے کی ممانعت ہو اسے ایذا پہنچانا تو اور بھی ناپسندیدہ ہوا. پھر پلٹ کر اگر ہوا طیش میں آجائے تو کس کے بس

میں ہے کہ اس سے پناہ پائے۔غصہ میں بھری ہوئی ہوا ہی تو تھی جس نے قوم عاد کو اکھاڑ پھینکا تھا۔اسی باد صرصر نے غزوۂ خندق کے موقعہ پر مشرک اتحادیوں کو میدان جنگ سے فرار پر مجبور کر دیا تھا۔

انسان پرستاروں کے اثرات کی کہانیاں نجومی بناتے ہیں،مگر کسی ذی شعور شخص کو انسانی مصائب کی وجوہات کھلی آنکھوں نظر نہیں آتیں۔مسلمانوں میں ماحولیات پر کام تو کجا فضا کی صحت پر تشویش بھی نہیں۔ بعض لوگ اس بات کو فخریہ بیان کرتے ہیں کہ ایرانی امریکی عالم ڈاکٹر حسین نصر دنیا میں واحد مسلمان ہیں جو کچھ ۲۵ برس سے ماحولیات کے موضوع پر اسلامی نقطۂ نظر سے لکھ بھی رہے ہیں اور محاضرات بھی دے رہے ہیں۔مگر کیا یہ بات واقعی قابل فخر ہے کہ دو ارب مسلمانوں میں فقط ایک شخص نے ماحولیات اور فضائی آلائش پر اسلامی اور قرآنی علوم کی اساس پر کچھ تحقیق کی ہے۔جنوبی ہند کی ریاست کرناٹک کے ساحلی قصبہ کوڈی میں ایک مسجد ''سبز اصولوں'' پر تعمیر ہوئی ہے۔جن دو انجنیروں کو یہ مسجد ڈزائن کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے وہ دونوں ہندو ہیں: سندیپ اور منوج۔

عوارض کا ایک سادہ سا تجربہ

سطح زمین اور فضاء میں جاری اس اضطراب و ارتعاش و لرزش کا لازمی اثر زمین پر بسنے والے تمام انسانوں اور دیگر جانداروں کے جسموں پر پڑتا رہتا ہے جو فضائی کثافت اور آلائش (pollution) کے ساتھ مل کر بلا شبہ جسمانی اور نفسیاتی عوارض کا ایک بڑا سبب ہے۔ایک سادہ سا تجربہ اس بات کو عام آدمی کے لئے قابل فہم بنا سکتا ہے۔اپنی بائیں ہتھیلی کو میز پر رکھ کر اس کی پشت پر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے تھپتھپانے کے انداز میں ایک گھنٹہ تک مسلسل ہلکی ضربیں لگائیے۔ایک گھنٹہ کے بعد بائیں ہتھیلی کی پشت کا جائزہ لیجئے۔اس کی جلد پر سرخی آگئی ہوگی، ہلکا سا درد بھی محسوس ہوگا اور خود دائیں ہاتھ کی انگلیوں کی حالت بھی غیر ہوگی،ان میں اور کلائی میں اور شانہ کچھ درد پیدا ہو چکا ہوگا۔اس عمل کے نفسیاتی نتائج اس کے علاوہ ہوں گے۔ویسے مشورہ یہی ہے کہ یہ تجربہ نہ کیا جائے۔خود کو تکلیف دینا تہذیب اور اسلام دونوں کے خلاف ہے۔

عام مشاہدہ ہے کہ اس دور کے عالمی معاشرہ میں دماغی کرب، ذہنی دباؤ،نفسیاتی الجھن، بے چینی اور بے اطمینانی، بے سکونی،تشنج،رعشہ،حزن، ہول، مالیخولیا، بیزاری، افسردگی، کشیدگی، تناؤ، ہیجان،عدم برداشت،وحشت، خشونت، غصہ، بے رحمی، دہشت گردی، جارحیت، تشدد، حیوانی جنسی جنون، بے مقصد اور انسان کش جنگوں میں فوجیوں کی درندگی،وحشت خیز،نفرت انگیز اور انسانیت سوز سیاسی بیانات وغیرہ

جیسی غیر فطری کیفیات میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ انیسویں صدی میں، اور بیسویں صدی کے آغاز میں پہلی عالمی جنگ سے پہلے دنیا کی یہ کیفیت نہیں تھی۔ ماضی کا میدان جنگ آج کے مصروف شہروں سے کہیں زیادہ امن کا نظارہ پیش کرتا تھا۔ اکثر و بیشتر ان مریضانہ کیفیات کا شکار ان ملکوں کے لوگ ہیں جہاں انیسویں صدی عیسوی میں صنعتی انقلاب آیا تھا اور جہاں اس انقلاب کے مادی فائدے سب سے زیادہ نمایاں ہوئے ہیں۔

یہ سب علم عناصر کے بے محابا استعمال کے نقصانات یا مضر اثرات ہیں اور آج روز کا مشاہدہ ہیں۔ بگڑی ہوئی اس صورت حال میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں۔ یہ بات قابل اطمینان ہے یا قابل مذمت؟

روحانی علوم کی حاکمیت

اسلامی تہذیبی اصول سے عہد رواں کے عدم تہذیب اور وحشت کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ مادی علوم پر کوئی حاکمانہ گرفت اور بالائی نگرانی باقی نہیں رہی۔ قرآن حکیم کا دوٹوک فیصلہ (البقرہ ۲: ۳۰ و ۳۵) یہ ہے کہ مادی علوم پر روحانی علوم کی حاکمیت ہی انہیں ضرررسانی اور عام فساد پھیلانے سے روکے رکھتی ہے۔ یہ حاکمیت ختم کردی جائے تو مادی علوم اس بندر کے ہاتھ کا استرا بن جاتے ہیں جو بے چارہ نہیں جانتا کہ اس کی جان کو کیسا خطرہ لاحق ہے۔

معاشرہ اگر دوسروں کو ایذا پہنچانے پر استوار ہو تو قرآنی اصول تاریخ کی رو سے وہ بے تہذیبی ہے، اور جب معاشرہ خود اپنے لئے خطرناک بن جائے تو تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے معاشروں کو بے تہذیب قوم کے ساتھ تباہ یا معدوم یا معزول کردیا جاتا ہے۔ ایسا بارہا ہو چکا ہے۔ اس زاویۂ نظر سے قوم نوح، عاد و ثمود، شداد اور فرعون کی تاریخ کا مطالعہ حیرت انگیز حقائق کی نقاب کشائی کرتا ہے اور انکشاف کرتا ہے کہ قرآن حکیم میں ان معدوم اور معزول اقوام کے تفصیلی ذکر کو کیوں اتنی اہمیت دی گئی ہے۔ ان کے علاوہ نمرودی بابلونیہ اور فرعونی مصر، یونان و روم، فارس و چین اور عہد حاضر کی سلطنت برطانیہ کے انحطاط، زوال اور خاتمہ کی داستانیں سوچ کو متحرک کرنے کے لئے کافی ہیں۔

چنانچہ تہذیب کی پہلی شرط یہ ہے کہ معاشرہ انسانوں کو ایذا پہنچانے پر قائم نہ ہو، بلکہ عوام الناس کے لئے مفید و نافع ہو۔ بالکل یہی اسلام کی عمرانی تعریف ہے اور یہی ملت اسلامیہ ہے یعنی وہ مثبت طریقۂ حیات جس پر اسلام کے پیروؤں کا میل اور جھکاؤ ہوتا ہے۔ رسول اللہ کا فرمان ہے کہ مومن وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے لوگ محفوظ ہوں (جامع ترمذی ۲: ۲۲۰-۲۲۱/ح ۵۲۳-۵۲۴)۔

دوسرے انسانوں کو ایذا پہنچانے کا تعلق معصیت سے ہے اور معصیت کفر کی علامات میں سے ہے اور کفر سے تہذیب کا تعلق نہیں ہوتا. اہل کفر تمدن بنا سکتے ہیں، فلک بوس اور ایک ایک میل اونچی عمارتیں زمین پر اٹھا سکتے ہیں. ہر دور میں یہ کام عموماً اہل کفر ہی نے کیا ہے. مگر وہ تہذیب بنانے پر قادر نہیں ہوتے. یعنی انسان میں کافرانہ خصائل جس قدر قوی ہوں گے وہ اتنا ہی ظالم اور موذی یعنی غیر مہذب ہوگا، خواہ اس کا تمدن ایک ایک میل اونچی عمارتوں پر قائم ہو. اس کے برعکس ایمانی خصائل جس قدر قوی ہوں گے انسان اتنا ہی رحم دل، بردبار، ہمدرد اور مخلوقات کو نفع پہنچانے والا، یعنی مہذب ثابت ہوگا، خواہ اس کی زندگی سادہ اور تکلفات سے بری ہو. اسلامی تہذیب کی مثال یہ ہے کہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کو مسلم و ذمی انسانوں ہی کا نہیں بلکہ فرات کے کنارے بیٹھی ہوئی بکری کی پیاس بجھانے اور بھوک مٹانے کا فکر بھی تھا (امام بیہقی. شعب الایمان۶:۴۳). دردمندانہ تہذیب کی یہ روایت حضرت عمرؓ پر ختم نہیں ہوگئی تھی.

کلمہ طیبہ کا انقلابی اثر

یہ کیفیت عام انسانوں میں مطلوب بھی ہے اور اسے حاصل کرنے کا گر بھی راز نہیں رکھا گیا. اس کی کلید کلمۂ طیبہ کی شکل میں دنیا کے سارے انسانوں کو دے دی گئی ہے. کلمہ طیبہ کے ۲۴ حروف ایک سادہ بیان نہیں، بلکہ نہایت عظیم شخصی نفسیاتی انقلاب کا نسخہ ہیں. دل کے یقین اور دماغ کی تائید کے ساتھ ایک بار ان حروف کے مجموعہ کا زبان سے ادا ہونا آدمی کی شخصیت کو بالکل بدل دیتا ہے، خواہ اس شخص کو اس روحانی اور نفسیاتی تبدیلی کا احساس نہ ہو. اس کا پہلا ثبوت رسول اللہ کا یہ فرمان ہے کہ جس نے ایک بار صدق دل سے کلمہ طیبہ پڑھ لیا وہ جنت میں داخل ہوگا (عن حضرت ابوموسی اشعری. ع: مسند امام احمد ابن حنبل ۳۲:۴۶۵/ ح ۱۹۶۸۹عن حضرت معاذ ابن جبل. ر: مسند امام احمد ابن حنبل ۱۰:۴۳۶/ ح ۲۲۳۵۳). ایک اور حدیث میں کلمہ طیبہ کو جنت میں داخلہ کا سب سے بلند دروازہ کہا گیا ہے (جامع ترمذی ۲:۲۱۶/ ح ۵۱۰). یہ معمولی بیان نہیں ہے. اس قول رسول کی عمرانی اہمیت آسمان کی طرح بلند، کوہ اُحد کی طرح محکم اور علمی تجزیہ کی متقاضی ہے.

حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کتنے بھی دنیا داری میں پڑ جائیں اور دینی واجبات سے کیسے ہی غافل ہو جائیں، ان کا ایک بار کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت پڑھ لینا ان کی فطرت کو اصل تکوینی ربانی نسخہ پر مرتب کرتا ہے اور اس پر قائم رکھتا ہے کہ جب شعور ہو جائے وہ اپنی اس عمرانی اصل کی طرف پلٹ آئے. اصطلاح میں اسے تو بہ کہا جاتا ہے. یہی وجہ ہے کہ مسلمان مزاجاً ایسی ایجادات سے پرہیز کرتے ہیں جو

متعمر ہوں اور جن سے رعونت، نفسانیت، تکبر، سرکشی، ہوس زر و مال، نفرت، خونریزی جیسی منفی صفات کو فروغ ہوتا ہے. سادہ لوح مسلمان فساد کا شکار ہو سکتا ہے، ہوتا رہا ہے، ہو رہا ہے. البتہ ایمان کی کمزور حالت میں بھی وہ کسی مروجہ فساد کا پیرو تو ہو سکتا ہے، کسی نئے فساد کا بانی بننے کی صلاحیت اس میں نہیں ہوتی. کیا جانے جو یہی وجہ ہو کہ مغربی ممالک میں آباد نہایت ذکی و ذہین اور شریف و متین مسلم سائنسداں لاشعوری طور پر اپنے ہم چشموں کے ہمساز نہیں ہوتے. کافی عرصہ ہوا ایک رپورٹ آئی تھی کہ امریکہ کی خلائی ایجنسی ناسا (Nasa) میں کم و بیش تین ہزار مسلم سائنسداں برسرکار ہیں. جس بات کی خبر بھی نہ بنی وہ یہ کہ امریکی خلائی تحقیقات میں آج تک کسی ایک بھی مسلم سائنسداں کا نام یا علمی حوالہ دیکھنے میں نہیں آیا اس کا سبب تعصب کے علاوہ بھی کچھ ہو سکتا ہے.

مسلم سائنسی رویہ کا نمونہ

بلاشبہ یہ ایک اجتماعی رویہ ہے. اس رویہ کی مثالیں عہد وسطی کے مسلمان سائنسدانوں کی ایجادات میں مل جاتی ہیں جن کا موازنہ عہد جدید کی اکثر ایجادات سے کیا جائے تو فرق کھل کر سامنے آجاتا ہے. ابن خلکان (۱۲۱۱-۱۲۸۲ء) کی سوانحی موسوعہ **وفیات الاعیان** سے امریکی سائنسداں مورخ جارج سارٹن (۱۸۸۴-۱۹۵۶ء) کی **سائنس کی تاریخ** تک جہاں جہاں تاریخ میں مسلمان سائنسدانوں کا ذکر آیا ہے تو ایک عجیب حقیقت سامنے آتی ہے کہ فوجی اسلحہ اور آلات قتل و غارت کی ایجادوں پر مسلم سائنسدانوں کی خصوصی توجہ نہ ہوئی اور ان کی اکثر ایجادات کا تعلق عام طور سے منافع للناس سے تھا. یہ حقیقت آج کے سائنسی رویہ سے میل نہیں کھاتی. مسلمان سائنسداں زندگی کے نقیب تھے، موت کے ہرکارے نہیں. ان کو پتا تھا کہ جہاد معاشرتی احوال کی اصلاح کی کوشش کا نام ہے، قتل عام اور نسل کشی کا ترقی یافتہ سائنسی نسخہ نہیں ہے.

مسلمانوں کے ملی رویہ کے سلسلہ میں قرآن حکیم کا بیان کافی ہے، جہاں کہا گیا ہے: وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهِ [ط] هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ [ط] مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ [ط] هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ [۵] مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ [ج] فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ [ط] (الحج ۲۲:۷۸) = اللہ کی خاطر جد و جہد کرتے رہو جیسا کہ اس کی خاطر جہاد کا حق ہے. اس نے تمہیں (دیگر امتوں سے) ممتاز کیا ہے اور دین کے معاملہ میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی تم اپنے باپ ابراہیم کی ملت پر (ہمیشہ) قائم رہو. اس (اللہ) نے تمہارا لقب

مسلمان رکھا ہے (نزول قرآن سے) پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی، تا کہ تمہارے (قابل شہادت اور معتبر ہونے کے) حق میں رسول اللہ گواہ ہوں اور تم تمام انسانوں پر گواہ ہو سو تم لوگ نماز کی پابندی رکھو، زکوۃ دیتے رہو اور مضبوطی کے ساتھ اللہ سے وابستہ رہو.

اطاعت قانون کی فطری روایت

اس آیت مبارکہ میں انسانی فطرت کے تکوینی اصول کا علم دیا گیا ہے کہ مسلمان اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کی ملت پر ہیں یعنی ہر معاملہ میں اللہ کی غیر مشروط حکم بردار انسانی جماعت کے طور پر منتخب کئے گئے ہیں. اسی کا نام اطاعت ہے. اس طویل آیت کی تفسیر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالی نے مسلمانوں میں اطاعت کا مادہ اس لئے زیادہ رکھا ہے کہ وہ اس کے ذریعہ کمالات حاصل کریں جس سے دنیا میں شرف و امتیاز حاصل ہونے کے علاوہ آخرت میں بھی ان کا بڑا شرف ظاہر ہو (**بیان القرآن** ۷/۱۵). چنانچہ اسلامی اصول سے خود مادیات میں بھی حصول کمال اور ارتقاء کا انحصار تجربہ گاہوں کے آلات اور کیمیاوی اجزا کی فراہمی سے زیادہ قانون کی مکمل اطاعت پر ہے. امام ابن جریر طبریؒ (**جامع البیان** ۱۸:۶۸۷) نے **اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ** کی تفسیر میں لکھا ہے کہ مراد نماز میں اطاعت اور تواضع ہے اور یہی فلاح کی ضمانت ہے. امام بغویؒ (**معالم التنزیل** ۵:۴۰۲) کا قول ہے کہ آیت میں جہاد سے مراد خود اپنی اصلاح ہے پھر چاہے کوئی اسے برا ہی سمجھے. مزید یہاں حضرت سدیؒ کا قول دیا ہے کہ جہاد کے معنی اطاعت ہیں، یعنی حکم عدولی اور بغاوت (معاصی) سے اجتناب. امام ابوالحسن علی الواحدیؒ (**الوسیط فی تفسیر القرآن المجید** ۳:۲۸۱) نے بھی سدیؒ کا یہ قول نقل کرتے ہوئے کہا ہے کہ اکثر مفسرین کا اتفاق اس پر ہے کہ **حق جهاده** سے مراد تمام اعمال میں اللہ کی اطاعت ہے. امام ابوالحسن ماوردیؒ تفسیر (**نکت والعیون** ۴:۴۲) میں لکھتے ہیں کہ "تمہارے باپ ابراہیم کی ملت" سے مراد عمل خیر ہے کہ یہی ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے.

سورہ **العصر** کی تفسیر میں شیخ عبدالحق حقانیؒ (**فتح المنان / تفسیر حقانی** ۸:۲۱۶) کہتے ہیں کہ انسان "اس عمر چند روزہ میں اگر نفع حاصل کرنا چاہے اور نقصان سے محفوظ رہنا چاہے . . .(تو) اول اپنی حیات میں کمال حاصل کرے اور دوم یہ کہ مرنے کے بعد بھی حسنات اور باقیات کا سلسلہ چھوڑ جائے." اسلامی تاریخ تہذیب ثابت کرتی ہے کہ مادی امور اس کمال سے خارج نہیں ہیں، اگر چہ اس کی شرطیں سخت ہیں.

کمال کے سلسلہ میں شیخ عبدالحق حقانیؒ (فتح المنان /تفسیر حقانی ۵:۲۵۳) یہ بھی لکھتے ہیں کہ انسانوں کے ''کمالات اپنے گھر کے نہیں (بلکہ یہ) بزرگی اللہ کی عطا کی ہوئی ہے''. گویا جس طرح خود علم اللہ کی خاص رحمت کے سوا کچھ نہیں ہے اسی طرح مادیات اور روحانیات میں کمال بھی اللہ کی دین ہے، انسان کی ذات سے وابستہ نہیں ہے. علم کسبی ہوتا ہے؛ کمال وہبی ہے. یہی وجہ ہے کہ ہر حکیم ابن سینؒا، ہر سائنسداں عبدالقدیر خان، ہر عالم ابو حنیفہؒ کے درجہ کمال کو کیوں نہیں پہنچتا.

یہاں ابن خلدون کی توضیح یاد آتی ہے کہ اعلیٰ علوم دراصل کمال حاصل کرنے کا زینہ ہیں اور تمام انسانوں پر علمی کمال حاصل کرنا واجب نہیں. البتہ عام لوگ اتنا علم ضرور حاصل کرلیں جس سے دنیا وآخرت میں نقصان سے محفوظ رہیں اور رزق حلال کی ضمانت انہیں حاصل ہو جائے. مادی علوم کے سلسلہ میں یہ خلدونی اصول کینڈا اور امریکہ میں تدریس و سند کے سلسلہ میں تعلیمی اقتصادیات (educational economy) کے عنوان سے رائج ہے جس کے تحت طلبہ کی ذہنی استعداد اور تعلیمی ذوق و معیار کا اندازہ سکولوں کی آٹھویں جماعت میں کرکے یونیورسٹیوں میں جانے کے اہل طلبہ و طالبات کی الگ درجہ بندی کردی جاتی ہے اور باقی طلبہ کی اکثریت کو چھوٹی حرفتوں، کاریگریوں اور خدمات عامہ کی تربیت کے زمرہ میں ڈال دیا جاتا ہے کہ انہیں کسی میدان علم میں اختصاص اور کمال کی حاجت نہیں ہے.

علمی تسلسل کا ابتکاری قانون

مسلمانوں کا یہ عمرانی رویہ ایمان کی حالت میں پیدا ہونے والا ایک فطری تسلسل ہے جس کا اشارہ رسولؐ اللہ کے ارشادات میں موجود ہے.

حجۃ الوداع کے موقعہ پر آیت اکمال و اتمام و رضا (**اَلۡيَوۡمَ اَكۡمَلۡتُ لَـكُمۡ دِيۡنَكُمۡ وَاَتۡمَمۡتُ عَلَيۡكُمۡ نِعۡمَتِىۡ وَرَضِيۡتُ لَـكُمُ الۡاِسۡلَامَ دِيۡنًا** [ط] - المائدہ ۵:۳ = آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کردیا، اور میں نے اپنی نعمت تم پر تمام کردی؛ اور میں نے اسلام کو تمہارے دین کے طور پر پسند کرلیا) کے نزول کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریبا روزانہ اہم خطبات ارشاد فرمائے تھے. ان خطبات میں جہاں ربانی اصول و فرامین کے مطابق مہذب معاشروں کے قیام کے کلیات واضح فرمائے وہاں ساتھ ہی امت کو حکم دیا کہ ۲۳ سال کی مدت میں نازل ہونے والی تمام آیتیں اور ساری سنتیں قیامت تک ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل کی جاتی رہیں (ابن سعدؒ. طبقات

الـــــکبـــــــریٰ ۱:۳۹۲)۔ یہ فقط علم کو آئندہ نسلوں تک منتقل کرنے کا حکم نہیں تھا۔ یہ کام تو دنیا کی ساری یونیورسٹیوں، کالجوں، سکولوں اور ٹیوشن گھروں میں بھی پیسوں کے عوض ہو رہا ہے۔ یہ دراصل امت میں ایک خاص مزاج پیدا کرنے، خاص عادت کو پروان چڑھانے اور خاص تہذیبی نظام قائم کرنے کا حکم تھا۔

بزرگ صحابہ کو احساس ہو چلا تھا کہ اس آخری آیت مبارکہ میں امت کو ایک بھاری ذمہ داری دی گئی ہے۔ حجۃ الوداع کے اس عظیم اجتماع کے ۸۱ دن بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے پردہ فرمالیا اور دین و دنیا کے تمام امور کی نگہداشت اپنے بعد بہترین انسانوں کی بہترین جماعت کے حوالہ کر دی تھی۔ اسی ذمہ داری کے احساس نے صحابہ کی ایک جماعت کو سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع کیا جہاں دین و دنیا کے امور کی نگرانی اور دنیا بھر میں اللہ کے قانون کے نفاذ کا نظام بالاتفاق قائم کیا گیا اور اسی سے فقہ اسلامی کا اساسی کلیہ اجماع امت طے ہوا۔ اس طرح اس عمرانی نظم کو ایک محکم ادارہ بنا دیا گیا تا کہ قیامت تک آنے والی نسلوں کو ایک علمی ترتیب اور عملی تمرین کے ذریعہ قوانین الٰہی اور فرمودات رسولؐ سے مربوط و متواصل رکھنے کی ضمانت حاصل ہو، رسولؐ اللہ کے حکم کی تعمیل میں فروگزاشت کا اندیشہ نہ رہے اور دنیا میں ایک بہترین اور قانون کا پابند، اللہ کی اطاعت پر مبنی معاشرہ مرتب کر دیا جائے۔ چنانچہ اسی دن سے صحابہ نے تابعین کی تربیت شروع کی اور جو علم رسول اللہ سے حاصل کیا تھا اسے ایک سے دوسری نسل میں اس شرط کے ساتھ منتقل کرنے کا نظام قائم کیا کہ حکم رسول کے مطابق اس امانت کو وہ اپنے بعد آنے والی ہر نئی نسل کو قیامت تک سونپتے چلے جائیں گے۔ اسلام کی پہلی تین نسلوں نے یہ کام جس ہوش مندی، دیانت داری اور خوش اسلوبی سے کیا اس کی دوسری مثال کسی اور امت نے پیش نہیں کی۔ کیوں نہ ہو حضرت عمرانؓ ابن حصین سے روایت ہے کہ ایک موقعہ پر رسولؐ اللہ نے فرمایا تھا: خَیْـرُ الـنَّـاسِ قَرْنِـی، ثُمَّ الَّـذِیْـنَ یَلُـوْنَھُـمْ، ثُمَّ الَّـذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ "=میرے زمانہ کے لوگ (صحابہ) سب سے بہتر ہیں، پھر ان کے بعد والے (تابعین)، پھر ان کے بعد والے (تبع تابعین) (جامع ترمذی ۲:۵۲/ ح ۱۰۰)۔

حجۃ الوداع کا عمرانی فیضان

غیر منقطع علمی تسلسل کی یہ حدیث سرسری نظر سے پڑھ لینے یا بیان کر دینے کے لئے نہیں ہے۔ دنیا کی تاریخ میں پہلی بار ایک مثالی امت کو نسل در نسل مسلسل اور مربوط روحانی علم سے جوڑ دیا گیا تھا کہ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے اور جب تک اسلام اس زمین پر زندہ ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ آج ہندستان کے

مولانا محمد اسلم قاسمی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، یا پاکستان کے مولانا مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا طارق جمیل، یا حجاز کے مولانا محمد ہشیم کیرانوی مکی، مولانا عبدالرحمن مظاہری، یا انگلستان کے مولانا یوسف موتالا، مولانا عبدالرحیم لمبادا، شیخ عبدالحکیم مراد سابق ٹموتھی ونٹر، مولانا محمد اکرم ندوی، یا جنوبی افریقہ کے مولانا سلیمان مُولا، مولانا عبدالرحیم خان، مولانا فرید الحق، یا ملیشیا کے سید محمد نقیب العطاس، یا بوسنیا کے مفتی مصطفیٰ سیرچ، مفتی حسین قرہ زووچ، یا کینڈا کے مولانا محمد آصف قاسمی، مولانا نورالدین غوری، مولانا محمد عمر صوبیدار، مولانا محمد بدات، یا امریکہ کے شیخ زید شاکر، شیخ حمزہ یوسف ہانسن سے پوچھا جائے تو وہ سب اپنے اپنے علم کی سند اپنے راست اساتذہ کے حوالوں سے تبع تابعین، تابعین اور صحابہ کے غیر منقطع واسطوں سے رسول اللہ تک اور یہی نہیں بلکہ حفاظ تو الفاظ قرآن اور تجوید و قرأت کی سند رسول اللہ کے بعد حضرت جبریلؑ کے واسطہ سے خود اللہ تبارک و تعالیٰ تک پہنچا دیتے ہیں۔

جس قوم میں علم کا یہ تسلسل پایا جائے گا وہ لامحالہ قانون کی پاسداری میں امتیاز حاصل کر لے گی کہ یہ اس کا علمی ذوق اور اس کی طبیعت ثانیہ ہے۔ چنانچہ قانون کی اطاعت مسلمان کی فطرت کا جزو بن گئی جو ایمانی کیفیت کا نتیجہ ہے۔ اس ایمانی کیفیت کا اضمحلال فطرت سے مسلمان کی بغاوت میں ابھر آتا ہے۔ علم کے تسلسل کا یہ نظام عجیب وغریب ہے۔ جس کی کوئی مثال دنیا میں یا دنیا کی کسی اور تہذیب میں نہ دیکھی گئی نہ پائی جاتی ہے۔ مادیات اساس جدید مغربی طرز تعلیم میں علم کی سند مسلسل اور متصل نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی نسل میں بار بار ٹوٹ جاتی ہے اور کسی شخص کے ایک استاد سے اگلی نسل کے استاد کا تعلق تو کجا اکثر تعارف تک نہیں ہوتا۔ اسی لئے اس نظام میں قانون کی اطاعت کا تعلق ذاتی سعادت مندی سے ہے، فطرت کے تقاضے اور علمی تربیت سے نہیں۔

تسلسل علم کی حدیث کی پیروی میں بزرگ صحابہ نے مدارس اور جامعات کا کردار ادا کرنا شروع کیا۔ وہ سنت جو مکہ مکرمہ میں دار ارقم ابن ابی ارقم میں اور پھر مدینہ منورہ میں صفہ پر قائم ہوئی تھی پہلے ہی وہلہ میں مدینہ سے مکہ، کوفہ، بصرہ، دمشق اور فسطاط تک پہنچ گئی، اور وہاں سے بڑھ کر اصفہان، رے، مرو، نیشاپور، بخارا، سمرقند، ہرات، بلخ، ملتان، دہلی، لاہور اور حیدرآباد تک اور دوسری جانب بغداد، بیروت، قیروان، ٹمبکٹو، تلمسان، مراکش، فاس، المیرہ، غرناطہ، قرطبہ، اشبیلیہ، برشلونہ اور پلرمو تک پھیل گئی۔ سچ یہ ہے کہ اہل یورپ نے علم کے اس انقلاب پر سیاسی اور صلیبی تعصب کی روک نہ لگا دی ہوتی تو

آٹھویں نویں صدیوں ہی میں یورپ کی نشاۃ ثانیہ ہو جاتی مگر علم حقیقی تو عظیم دریا ہے جو اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے. آج علم کے یہ دھارے انگلستان، بیلجیم، ہالینڈ، فرانس، اٹلی، جرمنی، کینڈا، امریکہ، پناما، آسٹریلیا، نیوزیلینڈ وغیرہ کی زمینوں کو سیراب کررہے ہیں، مگر سیلاب بھی لارہے ہیں.

تہذیبِ علم میں صلاح وفساد کا فرق

حاصل کلام یہ کہ عہد صحابہ ہی سے یہ التزام نظر آتا ہے کہ دنیا کو تہذیب اعتدال دینے کے لئے اول معاشرہ کو علوم ربانی یا علوم روحانی پر مستحکم کرنا ضروری ہے تا کہ جب مادی علوم پر توجہ کا وقت آئے تو قوم کے اہل علم ہی نہیں عامۃ الناس بھی اس روحانی مدار سے باہر نہ نکلیں اور عالم انسانیت کے لئے سود مند رہیں. اس کے ساتھ دنیا کو تہذیب اعتدال کے واسطے تیار کرنے کی خاطر اطراف و جوانب میں اسلام کے دائمی پیغام کو عام کرنے کی مہم پر توجہ دی جائے. صحابہ نے یہ فطری اصول قرآن حکیم سے اخذ کیا تھا جہاں دو ٹوک انداز میں انسانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ جب زمین پر اصلاح حال اور معاملات کی درستی کردی جائے تو اس پر فساد مت پھیلانا، کیونکہ اگر تم ایمان والے ہو تو یہی تمہارے لئے نفع مند ہے **(الاعراف ۷:۸۵)**، اور اگر تم اصلاح کی جدوجہد سے کنارہ کش ہو گئے تو احتمال ہے کہ زمین پر فساد برپا کردو گے، باہمی قرابت داریوں کو توڑ دو گے اور اللہ کی رحمت (یعنی سلطہ و اقتدار کی دولت) سے محروم کردیئے جاؤ گے **(محمد ۴۷:۲۲-۲۳)**. یہ قرآنی شرح ہے اس ربانی اصول کی جو زبور میں بھی لکھ دی گئی تھی کہ زمین کے وارث اللہ کے حکم بردار بندے ہی ہوتے ہیں **(الانبیاء ۲۱:۱۰۵)**.

ان اصول کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد **(قرآن کا قانون عروج و زوال ۱۰۰-۱۰۱)** نے ایک بار لکھا تھا کہ "انہی لوگوں کے حصہ میں ملک کی فرماں روائی آتی ہے جو نیک اور صالح ہوتے ہیں. صلح کے معنی سنوارنے کے ہیں؛ فساد کے معنی بگڑنے اور بگاڑنے کے ہیں. صالح انسان وہ ہے جو اپنے کو سنوار لیتا ہے اور دوسروں میں سنورنے کی استعداد پیدا کرتا ہے. یہی حقیقت بدعملی کی ہے. پس قانون یہ ہوا کہ زمین کی وراثت سنورنے اور سنوارنے والوں کو ملتی ہے. چنانچہ یہاں جو کچھ بھی ہے حق اور باطل کی آویزش ہے. لہٰذا بقاء انفع کا قانون ہے جس کے لئے اصلح کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے. یہاں وہ چیز باقی رہ سکتی ہے، جس میں نفع ہو کیونکہ یہی اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے. جس میں نفع نہ ہو وہ نہیں ٹھہر سکتی."

اس بیان پر نکتہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ بے شمار لوگ دنیا بھر میں حاکم بنے بیٹھے ہیں اگرچہ اس تعریف پر پورے نہیں اترتے. تو پہلی بات تو یہ کہ وراثت تو کسی کا حق ہوتی ہے مگر اس پر کوئی غیر مستحق غاصبانہ قبضہ کر لے تو اسے وارث نہیں مانا جاتا. دوسرے یہ کہ علامات قیامت میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ گھٹیا، نااہل، بدکار اور رذیل لوگ قوموں کے نمائندے اور قائد بن بیٹھیں گے (عن حضرت علیؓ و حضرت ابو ہریرہؓ: جامع ترمذی ۲:۴۸/ ح ۸۹--۹۰ عن حضرت انس ابن مالک. سنن ابن ماجہ ۳:۳۰۳-۳۰۴/ ح ۴۰۱۵). یہ وہ لوگ ہوں گے جو اصلاح کے بعد زمین کو فتنہ و فساد سے بھر دیں گے. اس مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کرتے ہوئے مولانا حامد الانصاری غازی (**اسلام کا نظام حکومت ۲۵۳**) کہتے ہیں کہ اگر "میراث اصل وارثوں کے ہاتھ سے نکل جائے اور غیر وارثوں کے حملہ سے مرعوب ہو جائے. . . تو اصل وارث کے لئے ضروری ہے وہ گمشدہ صلاحیتوں کو دریافت کر کے میدان عمل میں آئے، اپنے حق کو سمجھے." اس عہد کے مسلمان سائنسدانوں کے لئے یہی نسخۂ حیات ہے کہ وہ دوسروں کی نقالی کے جال سے نکل کر اپنے علمی وجود کی نئی دریافت کریں اور اس درجۂ کمال کو پہنچیں جو بطور ملت علم ان کا حق ہے.

دنیا میں اسلام کی راہ سے علمی انقلاب بڑی منطقی ترتیب اور سائنسی تدریج کے ساتھ آیا تھا. صحابہ نے ابتداء ہی میں تین بنیادی اسلامی علوم - قرآن، حدیث، فقہ - کو منضبط کرنا شروع کیا. جب ایک بار ایک صدی کی مدت میں تین نسلوں نے روحانی علوم کی ترتیب سے دنیا کا پہلا سائنسی فلسفۂ علم (epistemology) مرتب کر دیا تب مسلمان مادی علوم کی طرف متوجہ ہوئے تھے اور پھر چند ہی صدیوں میں انہوں نے وہ کارنامے کر دکھائے جن سے آج تک انسان فیضیاب ہو رہے ہیں. اس سلسلہ کا ایک بنیادی نکتہ جو عام مسلمان ہی نہیں مسلمان اہل علم کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رہ گیا وہ یہ کہ ماضی کے مسلمان سائنسداں پہلے عالم دین ہوتے تھے - خواہ امام ابو یوسف اور امام بخاری کے مرتبہ کو نہ پہنچیں - بعد میں اپنے ذوق کے مطابق مادی علوم میں اختصاص پر متوجہ ہوتے تھے. یہی سبب ہے کہ ان کی ایجادات اور اختراعات میں مضرت کا پہلو نہیں پایا جاتا تھا.

ماضی کے ان مسلم عالم دین سائنسدانوں کو نوبیل جیسا انعام کبھی نہیں ملا، لیکن ان کے احسانات کا تذکرہ مغربی دنیا میں آج بھی ہوتا رہتا ہے. نوبیل انعام پانے والوں کی اکثریت گمنام ہے. ☆☆

کتابیات